OPEN ACCESS: “*EPISTEMOLOGY*”
eISSN: 2663-5828;pISSN: 2519-6480
Vol.10 Issue 11June 2022

موقوف روایات سے استدلال: محدثین اور فقہاء کی آرا کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

REASONING FROM MAQUF NARRATIONS: A CRITICAL STUDY OF THE VIEWS OF NARRATORS AND JURISTS

Mirza Safdar Baig
PhD Scholar, Institute of Islamic Studies, University, of the Punjab, Lahore/Lecturer (Islamic Studies), Govt. College Basirpur, Okara.

Dr. Shahida Parveen
Director, Institute of Islamic Studies, University, of the Punjab, Lahore.

Abstract: The Holy Qur'an was revealed to the Holy Prophet (ﷺ). The companions (May Allah be pleased with them) were the first and foremost beneficiaries from the teachings of the Holy Qur'an and Hadith. The Companions read the commandments of the Holy Qur'an and the hadiths of the Prophet (ﷺ) and put them into practice. It all came down to us in the form of Mawqūf traditions. Regarding the Companions, Allah Almighty said: If people believe like you, they will be guided. Traditions regarding the faith and deeds of the Companions are found in the form of Mawqūf narrations. That is why Mawqūf traditions are important. There is a difference of opinion as to the reasoning behind the Mawqūf traditions. This article examines the views of Muhaddithin and jurists regarding the Mawqūf traditions. In this article, the lexical discussions of the Mawqūf traditions have been discussed. Whether they have an argument or not has been debated. What is the method of reasoning of the muhaddithin from the Mawqūf traditions? How

have they argued with them? The jurists of the ummah who took the correct interpretation of the religion and laid down the rules and regulations for it. It has been explained in detail how these traditions have been reasoned with in view of the principles. Similarly, a brief biography of the four jurists as well as what were their basic principles for inference in the rules of jurisprudence has been discussed in detail.

Keywords: Holy Qur'an,Holy Prophet (ﷺ), foremost beneficiaries,Mawqūftraditions,correct interpretation of the religion,basic principles for inference.

شریعت اسلامیہ جس کی اساس کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ان دونوں کی حفاظت کا ذمہ اللہ وحدہ لاشریک نے خود لیا. کتاب اللہ جو وحی جلی ومتلو، متواتر اور اللہ سبحان وتعالی کا اپنے بندوں سے کلام ہے فقہی احکام میں بنیادی مصدر کی حیثیت رکھتا ہے. اور سنت/حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کی شارح اور اس کے احکام کی تفصیل نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے قول، فعل اور تقریر کا مجموعہ ہے، جو مختلف اقسام پر مشتمل ہے. ان اقسام کا ایک طریقہ تقسیم مسند الیہ کے اعتبار سے ہے. جو مزید تین اقسام مرفوع، موقوف اور مقطوع میں منقسم ہے۔ حدیث موقوف کی تعریف جاننے سے قبل اس کے لفظی معانی جاننا ضروری ہیں۔

موقوف کا لغوی واصطلاحی مفہوم

موقوف کی اصل 'وقف' ہے۔ 'وقف' کے غالب معنی ٹھہرنے، رُکنے، مختص کرنے اور قرار پانے کے ہیں۔ وَقَفَ يَقِفُ وَقْفًاوَوَقُوفًا۔ ٹھہرنا۔ چپ چاپ کھڑا ہونا۔ موقوف اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں "روکا ہوا" اور "ٹھہرایا ہوا"، حدیث موقوف کو موقوف اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں راوی سلسہء سند کو صحابی تک روک دیتا ہے۔ (لغة: اسم مفعول من " الوَقف " كأن الراوي وقف بالحديث عند الصحابي، ولم يتابع سرد باقي سلسلة الإسناد، وقوف وقف کا اسم مفعول ہے ہے یعنی ٹھہری ہوئی چیز جس کا سلسلہ سند صحابی پر پہنچ کر رک جائے اور اس کے دیگر سلسلہ ہائے اسناد نہ پائے جاتے ہوں)۔[1] علمائے حدیث کے ہاں حدیث موقوف کی معروف اور مستند اصطلاحی تعریف یہ ہے: وهو المروي عن الصحابة قولا لهم أو فعلا أو نحوه متصلا كان أو منقطعا[2]. حدیث

موقوف اس حدیث کو کہتے ہیں جو صحابی سے ان کے قول، فعل یا تقریر کے ساتھ مروی ہو۔ (جس حدیث کی سند متصل نہ ہو اسے منقطع کہتے ہیں)

فقہاء کے اصول و مناہج

دوسری صدی ہجری کے اوائل سے چوتھی صدی ہجری کے نصف تک کا دور اجتہاد کا سنہرا دور ہے۔ اُفقِ اجتہاد پر تیرہ مجتہدینِ کرام چھائے ہوئے تھے۔ سفیان بن عیینہؒ مکہ میں، حسن بصریؒ بصرہ میں، امام مالک بن انسؒ مدینہ میں، امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کوفہ میں، امام اوزاعیؒ شام میں، امام شافعیؒ اور لیث بن سعدؒ مصر میں، اسحاق بن راہویہؒ نیشاپور میں، امام ابو ثورؒ، امام محمدؒ، امام داؤد ظاہریؒ اور ابن جریر طبریؒ بغداد میں منصبِ اجتہاد پہ فائز تھے۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ائمہ اربعہ کے علاوہ باقی تمام مجتہدین کے متبعین بھی ناپید ہو گئے۔

ہم ذیل میں ان ائمہ کرام کے فقہی اصول و مناہجذ کر کرتے ہیں:

حنفیہ کے اصول و مناہج

حنفیہ کے فقہی استنباط اور اُصولی منہج کی بنیاد سات اصولوں پر رکھی گئی ہے:

۱-: کتاب اللہ ۲:- سنتِ رسول اللہ ﷺ ۳:-اقوالِ صحابہؓ

۴:-اجماع ۵-: قیاس ۶:-استحسان ۷:-اور عرف

ان سات اُصولوں کی طرف تین نصوص میں اشارہ ملتا ہے۔

۱-: امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں: ''میں پہلے کتاب اللہ کو لوں گا، کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنت کو لوں گا، اگر نہ کتاب اللہ میں ملے اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں، تو میں قولِ صحابیؓ کو لوں گا۔ اقوالِ صحابہؓ میں مجھے اختیار ہے، جس کا قول چاہوں تو لوں اور جس کا چاہوں تو چھوڑ دوں، اور میں ان کے اقوال کو چھوڑ کر غیر کا قول نہیں لوں گا۔ جب معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء اور سعید بن المسیب پر آ پہنچے تو وہ ایک قوم تھی جس نے اجتہاد کیا، میں بھی اجتہاد کروں گا جیسے کہ انہوں نے اجتہاد کیا۔''[3]

مالکیہ کے اصول و مناہج

مالکیہ کے فقہی استنباط اور اُصولی منہج کی بنیاد بیس اُصولوں پر رکھی گئی ہے۔ ان میں سے پانچ کتاب اللہ اور پانچ سنتِ رسول اللہ ﷺ سے ہیں۔ کتاب اللہ کے پانچ اصول یہ ہیں:

۱: نص الکتاب، ۲: ظاہر الکتاب یعنی عموم کتاب، ۳: دلیل الکتاب یعنی مفہوم مخالف، ۴: مفہوم الکتاب یعنی مفہوم موافق، ۵: تنبیہ الکتاب یعنی کتاب اللہ کا علت پر تنبیہ کرنا، جیسے: قرآن کریم میں ہے: "فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا "[4]

سنتِ رسول اللہ ﷺ کے پانچ اُصول یہ ہیں:

۱: نص السنۃ، ۲: ظاہر السنۃ، ۳: دلیل السنۃ یعنی مفہوم مخالف، ۴: مفہوم السنۃ یعنی مفہوم موافق ۵: تنبیہ السنۃ۔ یہ ہو گئے کل دس اصول۔ باقی دس اصول مندرجہ ذیل ہیں:

۱: اجماع، ۲: قیاس، ۳: تعاملِ اہل مدینہ، ۴: قولِ صحابیؓ، ۵: استحسان، ۶: سدِ ذرائع، ۷: مراعاۃ الخلاف، امام مالکؒ کبھی اختلاف کی رعایت کرتے ہیں۔ ۸: استصحابِ حال، ۹: مصالحِ مرسلہ، ۱۰: شرائع من قبلنا۔

وہ اہم اصول کہ جن سے امام مالکؒ کی شہرت ہوئی، وہ یہ پانچ ہیں:

۱: عمل بالسنۃ، ۲: تعاملِ اہل مدینہ، ۳: مصالحِ مرسلہ، ۴: قولِ صحابیؓ، جب کہ سند صحیح ہو۔ ۵: استحسان۔[5]

شافعیہ کے اصول ومناہج

شافعیہ کے فقہی استنباط اور اُصولی منہج کی بنیاد چار اُصولوں پر رکھی گئی ہے: ۱: کتاب اللہ، ۲: سنتِ رسول اللہ ﷺ، ۳: اجماع، ۴: قیاس۔[6]

بعض حضرات اصولِ شافعیہ میں "تعاملِ اہلِ مکہ" کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

امام شافعیؒ نے "اقوالِ صحابہؓ" کو نہیں لیا، اس لیے کہ وہ صحابہؓ کے اجتہادات ہیں جن میں خطا کا احتمال ہے۔ عمل بالاستحسان کو بھی چھوڑ دیا جو کہ حنفیہ ومالکیہ کے ہاں ایک مستقل اصول ہے۔ امام شافعیؒ سے منقول ہے: "من استحسن فقد شرع" کہ "جس نے استحسان کیا، اس نے شریعت سازی کی" مصالح مرسلہ کی بھی تردید کی اور تعاملِ اہلِ مدینہ کے قابلِ استدلال ہونے کو بھی تسلیم نہیں کیا۔[7]

حنابلہ کے اصول ومناہج

حنابلہ کے فقہی استنباط اور اُصولی منہج کی بنیاد آٹھ اصولوں پر رکھی گئی ہے:

۱: کتاب اللہ، ۲: سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ۳: فتویٰ صحابیؓ، ۴: اجماع، ۵: قیاس، ٦: استصحابِ حال، ۷: مصالحِ مرسلہ، ۸: سدِ ذرائع۔

علامہ ابن القیم جنبلیؒ نے ''اعلام الموقعین'' میں فقہ حنبلی کے بنیادی اُصول پانچ ذکر کیے ہیں اور پھر ہر ایک اصل کے بیان کے لیے ایک مستقل فصل قائم کی ہے۔[8] ان پانچ اصولوں کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے:

۱: ظاہرِ نصوص ۲: صحابہؓ کے اتفاقی فتاویٰ یا جن کا خلاف منقول نہ ہو۔

۳: اختلافِ صحابہؓ کی صورت میں وہ فتویٰ جو قرآن وسنت کے زیادہ قریب ہو۔

۴: اگر صحابہ کرام سے صریح فتویٰ نہ مل سکے تو حدیثِ مرسل نیز ضعیف حدیث کو بھی لے لیتے ہیں، بشرطیکہ وہ شدید الضعف و منکر نہ ہو۔

۵: جب کوئی نص اور سلف کا قول نہ ملے تو پھر قیاس سے کام لیتے ہیں، لیکن ایسا بامرِ مجبوری ہی کرتے ہیں، جہاں نص یا قول سلف نہ ملے وہاں زیادہ تر سکوت اختیار فرماتے ہیں، رائے سے اجتناب فرماتے ہیں۔

محدثین کے اصول و مناہج

تمام محدثینِ کرام کا بالعموم اور محدثینِ احناف کا بالخصوص منہجِ استدلال یہ ہے کہ وہ حدیث کو قبول و رد کرنے اور متعارض نصوص میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں محض راویوں کی ثقاہت ہی کو پیش نظر نہیں رکھتے ہیں، بلکہ خارجی قرائن و شواہد کو بھی اس باب میں خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چند اُمور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پہلا اصول: قرآنِ حکیم سے موافقت

یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کا حرف حرف نص قطعی ہے اور اپنے ثبوت کے اعتبار سے ہر شک و شبہ سے بالاتر، احادیث میں سوائے احادیث متواترہ کے کوئی اس درجہ صحت و قوت کے ساتھ ثابت نہیں، اس لیے محدثینِ حنیفہ کے یہاں حدیث کے مقبول اور نامقبول ہونے میں قرآن مجید سے اس کی موافقت کو بڑا دخل ہے، گویا امام سرخسیؒ فرماتے ہیں۔

> اذا كان الحديث مخالفًا لكتاب الله فانه لا يكون مقبولا ولا حجة للعمل به، عامّةً كانت الآية أو خاصّةً، نصًّا أو ظاهرا عندنا، على ما بينا أن تخصيص العام بخبر الواحد لا يجوز ابتداء، وكذلك ترك الظاهر فيه، والعمل على نوع من المجاز لا يجوز بخبر الواحد عندنا، خلافا للشافعي"[9]

اسی طرح بعض روایتیں جو سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں، اس لیے قبول کر لی جاتی ہیں کہ وہ معناً قرآن سے مطابقت رکھتی ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: من جمع بين صلوتين من غير عذر فقد أتى بابًا من أبواب الكبائر[10] جس نے بلا عذر دو نمازیں جمع کیں، اس نے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔ اس روایت کا مدار، حنش بن قیس ہیں جو ضعیف ہیں، لیکن آیت قرآنی إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَاباً مَّوْقُوْتاً" [11] سے فی الجملہ اس کی تائید ہوتی ہے کہ نمازیں اپنے مقررہ اوقات ہی پر ادا کی جائیں، اس لیے محدثین کے یہاں معنًی یہ روایت مقبول ہے۔ متعارض احادیث کی ترجیح میں بھی محدثینِ احناف کے یہاں خصوصی طور پر اس اُصول کو خوب برتا گیا ہے کہ جو روایت اپنے معنٰی و مصداق کے اعتبار سے قرآن مجید سے موافقت اور قربت رکھتی ہو، اسے ترجیح دی جائے گی، چنانچہ احکام صلوٰۃ سے متعلق اکثر مشہور مسائل جن میں محدثینِ احناف اور فقہاء حجاز کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے پر غور کیا جائے تو احناف کا نقطۂ نظر اسی اُصول پر مبنی نظر آتا ہے، مثلاً ”امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے“ ہی کا مسئلہ ہے، حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت " لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" [12] جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی، اس کی نماز نہیں ہوئی) کے عموم سے مقتدی کے لیے قرأت کا وجوب ثابت ہوتا ہے، دوسری طرف آپؐ کا ارشاد بھی منقول ہے کہ: انما جعل الامام ليؤتم به، فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا" ۔[13] ”امام اس لیے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، چنانچہ جب وہ ”اللہ اکبر“ کہے تو تم بھی ”اللہ اکبر“ کہو، اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔“

یہ دونوں روایتیں بظاہر متعارض ہیں، فقہاء حجاز نے عام طور پر پہلی روایت کو ترجیح دیا ہے، اور سرّی اور بعضوں نے جہری نمازوں میں بھی مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کو واجب یا کم سے کم مشروع قرار دیا ہے، حنفیہ نے دوسری حدیث کو ترجیح دی، اس لیے کہ ارشاد خداوندی ہے: اِذَا قُرِأَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا " [14] سے یہی حدیث مطابقت رکھتی ہے اور پہلی روایت کو منفرد اور امام سے متعلق قرار دیا۔ قرآن سے موافقت کی بناء پر حدیث کا مقبول و نا مقبول ہونا، یا متعارض روایات میں اس کی بناء پر ترجیح دینے کے اُصول کو محدثینِ احناف نے زیادہ برتا ہے۔

دوسرا اصول: قواعدِ شریعت سے مطابقت

محدثینِ کرام کے طریقۂ استدلال کے سلسلہ میں یہ بات بھی ہے کہ ان کے یہاں روایات کے مقبول اور نامقبول ہونے میں اس بات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ جو روایت شریعت کے عمومی مزاج و مذاق اور اصول و قواعد سے مطابقت رکھتی ہے، بعض اوقات سند میں ضعف کے باوجود مقبول ہوتی ہے اور بعض روایتیں گو سند کے اعتبار سے قوی ہوتی ہیں، لیکن چوں کہ اپنے مضمون اور متن کے اعتبار سے شریعت کے عام اور مسلمہ اصول و مبادی کے خلاف ہیں، اس لیے ایسی حدیثیں رَد کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ قاضی ابوزید دبوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

الأصل عند أصحابنا أن خبر الآحاد متى ورد مخالفًا لنفس الأصول لم يقبل[15]

> ”ہمارے اصحاب کے نزدیک اصول یہ ہے کہ خبر واحد نفس اصول کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائے۔“

جیسا کہ محدثینِ حنفیہ کے یہاں بہت سے مسائل ہیں جو بظاہر اس اصول پر منطبق ہیں، جیسے حیوانات کے فضلہ کا ناپاک ہونا، عورت کے یا شرم گاہ کے چھونے کا ناقضِ وضو نہ ہونا، پتھر سے استنجاء میں تین پتھروں کا واجب نہ ہونا۔

مالکیہ کے یہاں بھی اس اصول کو زیادہ برتا گیا ہے، علامہ شاطبیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر روشنی ڈالی ہے: اذا جاء خبر الواحد معارضًا لقاعدة من قواعد الشرع هل يجوز العمل به؟ قال أبو حنيفة: لا يجوز العمل به وقال الشافعي: يجوز، وتردد مالك في المسئلة، قال: والمشهور والذي عليه المعول ان عضدته قاعدة أخرى قال به وان كان وحده ترك"[16]”خبر واحد شریعت کے قواعد میں سے کسی قاعدہ کے معارض ہو تو کیا اس پر عمل کرنا جائز ہوگا؟ امام ابو حنیفہؒ نے کہا کہ اس پر عمل کرنا جائز نہیں، امام شافعیؒ نے کہا جائز ہے، اور امام مالکؒ کو اس میں تردد ہے، اور مشہور قول جس کو قبول کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اگر دوسرا قاعدہ اس کی تائید میں ہو تو اسے قبول کیا جائے گا اور اگر خبر واحد تنہا ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔“ حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں واقعہ ہے کہ شریعت کے اصول و قواعد کی رعایت زیادہ ہے۔

تیسرا اصول: تلقّی بالقبول

حدیث کے مقبول ہونے کے سلسلہ میں محدثینِ کرام کے یہاں ایک اہم اصول یہ ہے کہ حدیث کا صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے درمیان درجۂ قبول حاصل کر لینا بجائے خود اس کے معتبر و مقبول ہونے کی دلیل ہے، اسی کو اہل علم نے ''تلقی بالقبول'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''تلقی بالقبول'' کی وجہ سے بعض روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے باوجود اہل علم کے یہاں پایۂ قبول حاصل کر لیتی ہیں اور اگر صحیح یا حسن ہیں تو ان کے استناد و اعتبار میں اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن بعض محققین کے نزدیک تو وہ تواتر کے درجہ میں آ جاتی ہیں، چنانچہ حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے طلاق الأمة **ثنتان وعدتها حيضتان** والی روایت منقول ہے، ابو بکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے :وان كان واردة من طريق الآحاد، فصار في حيز التواتر لأن ما تلقاه الناس من أخبار الآحاد بالقبول فهو عندنا في معنى المتواتر لما بيناه"[17] ''اگرچہ یہ خبر واحد کے طریقہ پر وارد ہوئی ہے، لیکن یہ تواتر کے درجہ میں ہے، اس لیے کہ جب خبر واحد کو لوگ قبول کر لیں، وہ ہمارے نزدیک تواتر کے حکم میں ہے، اسی بناء پر جو ہم بیان کر چکے ہیں۔''

تلقی بالقبول ان اسباب میں سے ہے جو ضعیف حدیث کو درجۂ اعتبار عطا کرتا اور صحیح حدیثوں کی قوت و صحت میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے اور ایک متفق علیہ اُصول ہے۔ البتہ احناف نیز مالکیہ نے اس اُصول کو زیادہ برتا ہے، مالکیہ کے نزدیک تعامل اہل مدینہ کو جو اہمیت اور اولیت حاصل ہے وہ در اصل اسی اصول کو برتنے سے عبارت ہے۔

چوتھا اصول: صحابہ کرام کا عمل اور رویّہ

حدیث کے اولین راوی چوں کہ صحابہ کرامؓ ہیں اور وہ سب کے سب عادل و ثقہ ہیں اور ان کی عدالت و ثقاہت پر خود حدیث نبوی شاہد عدل ہے، اس لیے کسی حدیث کے بارے میں صحابہؓ نے جو رویہ اختیار کیا ہے، محدثین کے یہاں اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

(الف) اگر کوئی حدیث ایسے مسئلہ سے متعلق ہو جس میں عہد صحابہ میں اختلاف رائے رہا ہو اور اس حدیث سے کسی نے استدلال نہیں کیا ہو تو علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان میں یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس حدیث میں کہیں کوئی کھوٹ موجود ہے اور یا تو یہ بعد کے راویوں کا سہو ہے یا پھر یہ حدیث منسوخ ہے۔[18] جیسے عہد صحابہ میں اس بابت اختلاف تھا کہ جو باندی آزاد کے نکاح میں ہو، اس کی طلاق تین ہو گی یا دو؟ لیکن حدیث الطلاق بالرجال والعدة بالنساء"[19] ''طلاق

میں مردوں کا اور عدت میں عورتوں کا اعتبار ہوگا'' سے استدلال نہیں کیا، اسی طرح نابالغ بچوں کے مال میں زکوٰۃ واجب ہونے کا مسئلہ صحابہ کے درمیان بھی اختلافی رہا ہے، لیکن حدیث ابتغوا فی أموال الیتامی خیرًا کیلا تأکلها الصدقة"[20] سے استدلال کرنا کسی صحابیؓ سے منقول نہیں، اسی لیے حنفیہ کے یہاں ان احادیث کی تاویل کی گئی ہے۔

(ب) کسی روایت پر صحابہؓ کے عہد میں عمل نہ کیا گیا ہو، یا علانیہ اسے ترک کر دیا گیا ہو تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس حدیث کا ظاہری مفہوم و مصداق مطلوب نہیں ہے، جیسے زنا کی سزا کے سلسلہ میں ''جلد'' (کوڑے لگانے) کے ساتھ ''تغریب عام'' (ایک سال کے لیے شہر بدر کرنے) کی سزا صحیح احادیث میں منقول ہے۔ [21] لیکن حضرت عمرؓ نے ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں فرمایا کہ آئندہ میں کسی کو شہر بدر کرنے کی سزا نہیں دوں گا۔ اس لیے حنفیہ محدثین نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرنے کے بجائے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ ''ایک سال شہر بدر کرنے'' کی سزا سیاست شرعیہ کی قبیل سے ہے اور قاضی و امیر کی صوابدید پر ہے، اسی طرح فتح خیبر کی نظیر حضرات صحابہؓ کے سامنے تھی، پھر بھی حضرت عمرؓ نے فتح عراق کے موقع سے اراضی عراق کی تقسیم نہ فرمائی، اس لیے حنفیہ کے نزدیک اراضی مفتوحہ کی بابت فیصلہ کرنے میں حکومت مصالح کے تحت فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔

(ج) اسی طرح صحابہؓ نے کسی روایت کو نقل کیا ہو، جو اپنے معنٰی و مصداق کے اعتبار سے واضح ہو، اس کے باوجود خود اس صحابی کا فتویٰ یا عمل اس روایت کے خلاف ہو تو حنفیہ کے یہاں ایسی روایت بھی نامقبول ہے، جیسے: حضرت ابوہریرہؓ سے ''کتے کے جھوٹے'' کے سلسلہ میں سات دفعہ دھونے کی حدیث مروی ہے۔ [22] لیکن خود ان کا فتویٰ تین دفعہ دھونے کا ہے حنفیہ نے امام طحاویؒ کی حدیث کو اصل بنایا جس میں تین دفعہ دھونے کا ذکر ہے، [23] اور سات بار والی روایت کو استحباب پر محمول کیا۔ اسی طرح امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر اکثر وتر ادا فرمایا کرتے تھے۔ [24] لیکن خود حضرت عبداللہؓ کا معمول نقل کیا گیا ہے کہ وتر ادا کرنے کے لیے سواری سے نیچے اتر آتے تھے، لہٰذا حنفیہ نے اسی پر عمل کیا، اور جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر پڑھنے کا ذکر ہے، اسے تہجد پر محمول کیا، کیونکہ حدیث میں وتر کا لفظ تہجد کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ سے وہ روایت منقول ہے جس میں عورت کے نکاح کے لیے ولی کو ضروری قرار دیا گیا ہے لا نكاح الا بولی" [25] لیکن خود حضرت عائشہؓ نے اپنی بھتیجی

یعنی حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کی لڑکی کا نکاح والد کی عدم موجودگی میں خود کیا ہے۔[26] اسی لیے حنفیہ کے نزدیک بالغ لڑکی پر اولیاء کی ولایت استحبابی ہوگی نہ کہ وجوبی۔

پانچواں اصول: فقیہ کی روایت کو ترجیح حاصل ہونا

محدثینِ کرام میں سے امام ابو حنیفہؒ کے ہاں یہ قاعدہ ہے کہ اگر دو حدیثیں متعارض ہوں اور سند کے اعتبار سے دونوں ہی صحیح ہوں تو امام صاحب ایسی روایت کو ترجیح دیتے ہیں جن کو اصحاب فقہ راویوں نے نقل کیا ہے، اس کی بہترین مثال امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان دار الحناطین مکہ میں رفع یدین کے مسئلہ پر ہونے والا مناقشہ ہے، جس میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے راویوں کے تفقہ کو ملحوظ رکھ کر ”حماد عن ابراہیم عن علقمہ واسود عن عبد اللہ بن مسعود“ کی سند کو ”زہری عن سالم عن عبد اللہ بن عمر“ پر ترجیح دی اور واسطوں کے کم ہونے کے مقابلہ میں، راوی کے تفقہ کو آپ نے زیادہ اہم سمجھا۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اس مناقشہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

> فرجح بفقه الرُواة كما رجح الأوزاعي بعلو الاسناد وهو المذهب المنصور عندنا"[27]
>
> ”امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے راویوں کے تفقہ کی بنا پر حدیث کو ترجیح دی جیسا کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے سند کے عالی ہونے کی بنا پر اور یہی (تفقہ کی بنا پر ترجیح) ہمارے نزدیک مذہبِ منصور ہے۔“

چھٹا اصول: متنِ حدیث کو شریعت کے مقصد و مزاج کے مطابق پرکھنا

اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جہاں محدثین نے اصول روایت کے اعتبار سے ذخیرۂ حدیث کو پرکھا ہے اور اس کے لیے تحقیق رجال کا وہ عظیم الشان کام سر انجام دیا ہے کہ تاریخ مذاہب میں اس کی مثال نہیں مل سکتی اور مستشرقین تک نے اس کا اعتراف کیا ہے، وہاں محدثین اور بالخصوص محدثینِ احناف نے متن حدیث کو کتاب اللہ، شریعت کے عمومی اہداف و مقاصد اور مزاج و مذاق نیز جو واقعات مروی ہیں، ان کے تاریخی پس منظر کی روشنی میں پرکھنے کی جو کوشش کی ہے اور درایت حدیث کے جو اُصول و قواعد قائم کیے ہیں، ان کی داد نہ دینا بھی ناانصافی ہوگی۔ اس سلسلہ میں محدثین کے دو اُصولی اختلاف کی طرف اشارہ کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے، اول یہ کہ تابعین کی مرسل روایات میں درمیان کے واسطوں کو حذف کر کے براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی گئی روایات، حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک حجت ہیں، بشرطیکہ راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ عام طور پر وہ ثقہ راویوں ہی سے روایت لیتا ہے۔[28] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعد کے اہل علم نے عام طور

پر سند میں انقطاع کی وجہ سے مراسیل کے قبول نہیں کیا ہے، حنفیہ نے مرسل روایات اور خاص کر امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی مراسیل سے بہ کثرت استدلال کیا ہے، جس کا اندازہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہا اللہ کی ''کتاب الاثار'' سے کیا جا سکتا ہے۔

ساتواں اصول: صحابہ کے آثار و فتاویٰ

دوسرے جن مسائل میں احادیث مرفوعہ موجود نہ ہوں، کہا جا سکتا ہے کہ ان میں محدثینِ کرام کے ہاں صحابہ کے فتاویٰ کی حیثیت قول آخر کی ہے اور عام طور پر وہ اس سے تجاوز نہیں کرتے، خاص طور پر حنفیہ اور حنابلہ کے یہاں فتاویٰ و آثارِ صحابہؓ کو اس درجہ اہمیت دی گئی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں محدثینِ احناف کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ

(I): کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں قیاس کو دخل نہ ہو اور اس سلسلہ میں ایک ہی صحابی کا قول منقول ہو، صحابہ کے درمیان اختلاف نقل نہ کیا گیا ہو تو قول پر عمل کرنا واجب ہے :ولا خلاف بين أصحابنا المتقدمين والمتأخرين أن قول الواحد من الصحابة حجة في مالا مدخل للقياس في معرفة الحكم فيه"[29]'' ہمارے متقدمین و متاخرین اصحاب کے درمیان اس بابت کوئی اختلاف نہیں کہ ایک صحابی کا قول بھی ان مسائل میں حجت ہے، جن کا حکم جاننے میں قیاس کا کوئی دخل نہیں۔'' چنانچہ حضرت انسؓ کے قول پر حیض کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن ابی العاصؓ کے قول پر نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن، حضرت عائشہؓ کے قول پر حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال اور حضرت علیؓ کے قول پر مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم حنفیہ نے مقرر کی ہے، کیوں کہ مقدار اور مدت کی تعیین میں اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔

(II) کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو اور ایک ہی صحابی کا قول منقول ہو، اس صورت میں اختلاف ہے، ابو بکر جصاص رازی، ابو سعید بردعی، فخر الاسلام بزدوی، شمس الائمہ سرخسی اور ابو الیسر رحمہم اللہ وغیرہ کی رائے پر اس صورت میں بھی قول صحابی حجت [30] ہے اور اس پر عمل واجب ہے۔ یہی رائے مالکیہ کی ہے، یہی ایک قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ کا قول قدیم تھا۔ [31] امام کرخی اور قاضی ابو زید دبوسی کا خیال ہے کہ ایسی صورت میں قول صحابی حجت نہیں، بلکہ قیاس پر عمل کیا جائے گا۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ کا قول جدید ہے۔ [32]

(iii) اگر کسی مسئلہ میں صحابہ کے ایک سے زیادہ اقوال ہوں تو پھر امام ابو حنیفہؒ اُن میں سے انتخاب کرتے ہیں اور جو قول قرآن سے قریب تر اور مزاجِ دین سے موافق تر محسوس ہوتا ہو اس کو اختیار کرتے ہیں۔

آٹھواں اصول: قیاس کے مقابلہ میں ضعیف روایت کو ترجیح

محدثین کے یہاں حدیث پر عمل کا اس درجہ اہتمام ہے کہ ان کے یہاں یہ بات اُصول کے درجہ میں ہے کہ جن مسائل میں کوئی حدیث موجود نہ ہو، لیکن ایسی ضعیف روایات موجود ہوں جن کے راوی پر کذب کی تہمت نہ ہو تو بمقابلہ قیاس کے ایسی ضعیف احادیث پر عمل کیا جائے گا۔ مشہور محدث اور فقیہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے حنفیہ کا مذہب اس طرح بیان کیا ہے: "ان مذهبهم تقديم الحديث الضعيف على القياس المجرد الذى يحتمل التزييف"[33] "حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ حدیثِ ضعیف کو مجرد قیاس پر جو کھوٹ کا احتمال رکھتا ہے مقدم رکھا جائے۔"

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث ضعیف پر عمل کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

> شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدة ضعفه، وأن لا يعتقد سنية ذلک الحديث"[34]
>
> "حدیث ضعیف پر عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ اس کا ضعف شدید نہ ہو، اور اس کے سنت سے ثابت ہونے کا اعتقاد نہیں رکھے۔"

نواں اصول: روایتِ حدیث میں کسی جزو کا ذکر نہ ہونا موجبِ قدح نہیں

صحابہ کرامؓ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب کوئی حدیث نقل کرتے تو بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ بعض مضامین حدیث روایت کر دیتے اور کچھ باتیں رہ بھی جاتیں جو دیگر صحابہؓ کے ہاں یا انہی صحابہ کی کسی دوسری روایت میں مل جاتیں، یہ بعض مضامین کا رہ جانا اس پہلو سے کبھی نہ ہوا تھا کہ وہ بعض اجزاء باقی حدیث کے معنی پر اثر انداز ہوں؛ بلکہ ہر حصہ مضمون اپنی جگہ مستقل حیثیت سے روایت ہوتا تھا؛ سوائمہ حدیث اس پر متفق رہے ہیں کہ روایت حدیث میں کسی بات کا نقل سے رہ جانا باقی روایت میں موجب قدح نہیں ہے، امام زہریؒ حدیث افک کے واحد راوی ہیں، جو مختلف تابعین کرامؒ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: کہ ان راویوں نے حدیث افک کے کسی حصہ کو میرے سامنے بیان کیا ہے"۔[35] امام زہری تصریح نہیں کرتے کہ کون سا حصہ کن راویوں نے بیان کیا ہے لیکن یہ راوی چونکہ

سب کے سب ثقہ ہیں، اس لیے یہ جانے بغیر کہ کس کس راوی نے کیا کیا کہا ہے، پوری حدیث بالاتفاق قبول کرلی گئی ہے اور ساری حدیث صحیح تسلیم کرلی گئی ہے، امام نوویؒ(۶۷۶ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

> "یہ طریقہ جو زہری نے جمع حدیث میں اختیار کیا ہے جائز ہے ممنوع نہیں اور اس میں کوئی ناپسندیدگی نہیں یہ بیان ہوچکا ہے کہ حدیث کا کچھ حصہ ان میں سے کسی سے ہے اور کچھ حصہ دوسروں سے ہے اور یہ چاروں تابعین حفاظ حدیث اور اپنے فن کے امام ہیں؛ اگر اس میں کچھ تردد رہا ہے کہ یہ لفظ اس راوی کی روایت سے ہے یا اس راوی کی روایت سے، تو اس میں کوئی حرج نہیں اس سے احتجاج جائز ہے؛ کیونکہ وہ دونوں ثقہ ہیں اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص کہے مجھے یہ حدیث زید نے بتائی یا عمرو نے اور وہ دونوں ثقہ ہیں، مخاطب کے ہاں معروف ہیں تو اس سے حجت پکڑنا اور احتجاج کرنا جائز ہے"۔[36]

دسواں اصول: حدیث کی تصحیح کے طرق

محدثین کے یہاں حدیث کی تصحیح کے دونوں طریقے رائج رہے ہیں:

۱۔ راویوں کی ثقاہت ان کے باہمی اتصال اور شذوذ و نکارت سے سلامتی معلوم کرکے بھی کسی حدیث کو صحیح کہہ سکتے ہیں۔
۲۔ کبھی ان تفصیلات میں جائے بغیر اکابر علمائے فن کی تصحیح پر اعتماد کرکے بھی کسی حدیث کو صحیح کہا جاسکتا ہے۔

قبولیت روایت میں اصل الاصول اعتماد ٹھہرا تو جس طرح سے بھی یہ اعتماد حاصل ہوسکے روایت قابلِ قبول ہوجاتی ہے۔ ہر فن میں اکابرِ فن کی تقلید کی جاتی ہے، اس سے انسان اسی وقت نکلتا ہے جب خود براہِ راست راویوں کی جانچ پڑتال کرسکے اور اس کی جملہ طرق پر نظر ہوسکے، اس کے بغیر اعتماد سے چارہ نہیں، اس اعتماد کو بھی علم کی ہی ایک شان سمجھنا چاہیے، جس بات میں خود مضبوط علم حاصل نہ ہو تقلید سے چارہ نہیں، ہاں جب کسی بات کی براہِ راست تحقیق ہوجائے اور اس میں کوئی شک باقی نہ رہے تو پھر تقلید درست نہیں؛ لیکن جب تک راویوں کا پورا علم خود حاصل نہ ہو محدثین کرام جو ائمہ فن ہیں ان کی تصحیح اور ان کی تضعیف سے بھی علماءِ حدیث کسی روایت کو صحیح یا ضعیف کہہ سکتے ہیں۔ جب تک راویانِ حدیث اپنی سند سے حدیثیں روایت کرتے رہے تحقیق حدیث کا طریق راویوں کی جانچ پڑتال ہی رہا؛ لیکن جب سند والی کتابیں مدون ہوچکیں اور اس جمع شدہ ذخیرے سے ہی حدیث آگے چلی تو اس دور میں علیحدہ علیحدہ راویوں کی جانچ پڑتال کے ساتھ حاذق محدثین کی تحقیق اور اکابر اساتذہ فن کا ذوق بھی ساتھ چلنے لگے تو اب راویوں کی بجائے اساتذہ فن کے

فیصلوں پر اعتماد کے بغیر آگے نہیں چل سکتے؛ یہاں اہلِ فن کی تقلید سے چارہ نہیں، ہر شخص کا ذوق اس درجے میں پختہ نہیں ہوتا کہ محض راویوں کے حالات جان کر پوری سندع اور پوری حدیث پر وہ کوئی حکم لگا سکے۔

گیارہواں اصول: ترجیح وتطبیق کے مختلف اسالیب

شریعت تدریجاً تکمیل کو پہنچی ہے؛ کئی امور جو پہلے جائز یا ناجائز تھے بعد میں ناجائز اور جائز قرار پائے سو اگر کسی موضوع پر متضاد روایات ملیں تو پہلے جو بات ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک حکم پہلے دَور کا ہوگا جواب منسوخ ہو چکا، یہ اس صورت میں ہے کہ دونوں کی تاریخ معلوم ہو سکے اور اگر عقلاً دونوں میں سے کسی کو آگے پیچھے کیا جائے تو یہ نسخ اجتہادی ترجیح کے بعد لائقِ غور ہوگا۔ نسخ کی بات نہ کھلے تو پھر راجح کو دیکھا جائے وجوہ ترجیح سامنے آنے سے ایک بات خود بخود کمزور دکھائی دینے لگے گی ترجیح نہ دے سکیں تو نسخ اجتہادی سے کام لیں اس کے بعد تطبیق کی راہ ہے کہ ہر ایک کو جدا محمل پر محمول کیا جائے پھر بھی بات نہ بنے تو دونوں کو رہنے دیا جائے اور تساقط پر فیصلہ کر لیا جائے حنفیہ کے ہاں پہلے نسخ پھر ترجیح پھر تطبیق اور پھر تساقط کی ترتیب ہے، شافعیہ کے ہاں پہلے تطبیق پھر ترجیح پھر نسخ اور پھر تساقط کا عمل ہوگا: "واذاتعارض الحدیثان ففی کتب الشافعیه یعمل بالتطبیق ثم بالترجیح ثم بالنسخ ثم بالتساقط وفی کتبنا یوخذا ولابالنسخ ثم بالترجیح ثم بالتطبیق ثم بالتساقط"[37] تعارضِ حدیثین کی صورت میں کتبِ شافعیہ میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے تطبیق پھر ترجیح پھر نسخ اور پھر تساقط پر عمل ہوگا اور کتبِ حنفیہ میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے دونوں پر عمل کیا جائے گا اور نسخ سے کام نہیں لیں گے، پھر ترجیح یا پھر تطبیق۔

خلاصہ بحث

قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں اس پر عمل کر کے اس کی تشریح پیش کی جس کو حدیث کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم اور حدیث سے اولین مستفید ہونے والی جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے قرآن کریم اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفادہ کیا اور عمل کر کے دکھایا۔ یہ سب موقوف روایات کی شکل میں ہم تک پہنچا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر لوگ تمہاری طرح ایمان لائیں گے تو وہ ہدایت یافتہ ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے ایمان اور عمل کے حوالے سے روایات ہمیں موقوف روایات کی صورت میں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موقوف روایات اہمیت کی حامل ہیں۔ موقوف روایات سے

استدلال کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مضمون محدثین وفقہاء کی موقوف روایات سے متعلق آراء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس لیے یہ مضمون ''موقوف روایات سے محدثین وفقہاء کے طرز استدلال کو جاننے میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس موضوع میں موقوف روایات کی لغوی مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان کے حجت ہونے یا نہ ہونے پر بحث کی گئی ہے۔ موقوف روایات سے استدلال کا محدثین کا منہج فقہاء امت جنہوں نے دین کی صحیح تشریح کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے اصول و قوانین مقرر کیے دیگر فقہاء نے بالعموم اور فقہاء اربعہ نے بالخصوص ان روایت سے استدلال کے لیے مناہج اور انہوں نے ان روایات سے استدلال کے لیے اصول اور ان اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان روایات سے استدلال کا تذکرہ کیا ہے اسی طرح فقہاء اربعہ کے مختصر احوال زندگی کے ساتھ ساتھ فقہی احکام میں استنباط کے لیے ان کے بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

[1]۔ محمود الطحان، ڈاکٹر، تیسیر مصطلح الحدیث (لاہور: مکتبہ رحمانیہ، 2013ء)، 129۔

[2]۔ السخاوی، محمد بن عبد الرحمن، فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث (بیروت: دار المناہج، 1426ھ)، 1:195۔

[3]۔ ابو حنیفۃ لابی زھرۃ ص 208، 207

[4]۔ الزحیلی، ڈاکٹر وہبہ، الفقہ الاسلامی وادلتہ (بیروت: دار الفکر، 1996ء)، 1:32، 31۔

[5]۔ الزحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، 3:32، 31۔

[6]۔ السرخسی محمد بن احمد، اصول السرخسی (بیروت، دار المعرفۃ، 1997ء)، 1:364۔

[7]۔ النساء، 4:103۔

[8]۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (دار طوق النجاۃ، 1422ھ)، 1:85، الرقم: 378۔

[9]۔ الاعراف، 7:10۔

[10]۔ السیوطی، جلال الدین، عبد الرحمٰن بن ابو بکر، تدریب الروای (بیروت: دار الکتاب العربی، س۔ن)، 1:48۔

[11]۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ، جامع الترمذی، (الریاض: دار السلام للنشر، 1430ھ)، 2:344، الرقم: 479۔

[12]۔ الترمذی، جامع الترمذی، 2:344، الرقم: 479۔

[13]۔ البقرة، 45:2۔

[14]۔ البیہقی، أحمد بن حسین، السنن الکبری، (بیروت: دار الفکر، 1416ھ)، 574:7

[15]۔ عثمانی، ظفر احمد، قواعد فی علوم الحدیث (الریاض: دار السلام للنشر، 1430ھ)، 62۔

[16]۔ لکھنوی، عبدالحہ، الاجوبة الفاضلة للاسئلة العشرة الکاملة (بیروت: مکتب المطبوعات الاسلامیة، س۔ن)، 51۔

[17]۔ ملاجیون، حافظ الدین النسفی، کشف الأسرار شرح المصنف علی المنار (بیروت: دار الکتب العلمیة، 1433ھ)، 13:2۔

[18]۔ الطحاوی، احمد بن محمد، مشکل الآثار (مکة المکرمة: دار الباز، 1412ھ)، 23:1۔

[19]۔ الترمذی، جامع الترمذی، 335:2، الرقم: 472۔

[20]۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، سنن ابن ماجہ (بیروت:: داراحیاء الکتب العربیة، س۔ن)، الرقم: 1881۔

[21]۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، سنن ابن ماجہ (بیروت:: داراحیاء الکتب العربیة، س۔ن)، الرقم: 1881۔

[22]۔ ابن الھمام، فتح القدیر، (بیروت :دار الکتب العلمیة، 1422)11:3۔

[23]۔ البخاری، محمد امین بن محمود، المعروف بأمیر بادشاہ الحنفی، تیسیر التحریر (بیروت: دار الکتب العلمیة، 1403ھ)، 167:3۔

[24]۔ رازی، فخر الدین، محمد بن عمر، المحصول فی علم الاصول (الریاض: جامعه الامام محمد بن سعود الاسلامیه، س-ن)، 454:2۔

[25]۔ شوکانی، محمد بن علی، ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول (مصر: المصطفٰی البابی الحلبی، س-ن)، 267۔

[26]۔ الزبیدی، محمد بن ابراھیم، قفو الاثر فی صفو علوم الاثر (حلب: المطبوعات الاسلامیة، 1408ھ)، 67۔

[27]۔ السرخسی، اصول السرخسی، 361:1۔

[28]۔ السرخسی، اصول السرخسی، 11:2۔

[29]۔ الحنفی، محمد بن محمد، التقریر والتحبیر (بیروت: دار الکتب العلمیة، 1983ھ)، 310:2۔

[30]۔ آمدی، سیف الدین، الاحکام فی اصول الاحکام (بیروت: مکتبہ العصریہ، 2010ء)، 357:2۔

[31]۔ السرخسی، اصول السرخسی، 106:2، 105۔

[32]۔ مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، (بیروت: داراحیاء التراث العربی، س۔ن)، الرقم: 982۔

[33]۔ الحصکفی، علاء الدین، محمد بن علي بن محمد الحِصْني (م: 1088ھ)، الدر المختار (بیروت، دار الفکر، طبع ثانیه، 1412ھ)، 1: 128۔

[34] ۔ الحصکفی، الدر المختار، 87:1۔

[35] ۔ النووی، یحییٰ بن شرف، صحیح مسلم بشرح النووی، (بیروت: دار الفکر، 1401ھ)، 364:10۔

[36] ۔ النشاپوری، محمد بن عبداللہ، معرفۃ علوم الحدیث (بیروت: دار ابن حزم، 1424)، 11۔

[37] ۔ کاشمیری، محمد انور شاہ (م 1353ھ)، العرف الشذی شرح سنن الترمذی (بیروت: دار التراث العربی، 2004ء)، 1:52۔